حضرت شیخ الہند کا احسانی وعرفانی مقام

(حصہ اوّل)

جناب محمد ظفر اقبال

zafar.q.iqbal@gmail.com

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی زندگی اتنی ہمہ جہات اور متنوع اوصاف وکمالات سے مملو ہے کہ اگر ان کی بابرکت زندگی کے کسی ایک ہی گوشے کو موضوع بنا کر اس پر لکھا جائے تو مختلف عنوانات پر ایک ایک بسیط مقالہ تیار ہوسکتا ہے۔اس حقیقت کے برعکس یہ بات بھی بہت قابل مشاہدہ ہے کہ آزادیٔ ہند کی مختلف تحریکات میں قائدانہ اور جاں فروشانہ شمولیت نے شیخ الہندؒ کی عظیم شخصیت کو جہاد، سیاسیات اور تحریکات میں قیادت کا استعارہ بنا دیا ہے۔ بلاشبہ شیخ الہندؒ کی میدان جہاد وتحریکات میں خدمات اس لائق ہیں کہ منصب امامت اور نقش ہدایت کے لیے برعظیم میں سید احمد شہیدؒ کے بعد اگر کسی شخصیت کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ بجاطور پر صرف شیخ الہند محمود حسنؒ ہیں —— جہاں اس تکرار و گردان اور تحقیق وتفتیش نے میدان جہاد، تحریکات، زندان واسیری کے ایام میں شیخ الہندؒ کی حیات کے تقریباً ہر گوشے کو منظر عام پر لا کر اس باب میں اتباع کی بڑی راہ فراہم کی ہے اور اخلاف کو سلف کے طریق جہاد وسیاست کی ایک محفوظ راہ دکھائی ہے، وہیں اس عمل اور رویے سے، لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن، شیخ الہند کی زندگی کے بہت سے باطنی، احسانی، عرفانی، اخلاقی، سماجی اور تعلیمی پہلو نظر انداز ہوگئے ہیں، یا اس طرح واضح ہو کر منصۂ شہود پر نہیں آسکے کہ ان سے بلاتحقیق وتفحص رہ نمائی لی جاسکے —— اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر شیخ الہندؒ کی زندگی کا بہ نظر امعان مطالعہ کیا جائے تو آپ کی شخصیت علم وفضل، درس وتدریس، افتا وتصنیف، مناظرے ووعظ اور سلوک وعرفان میں بھی جہادی اور تحریکی سرگرمیوں ہی کی طرح جامع اور منصب امامت پر فائز نظر آئے گی۔

استحضار الٰہی اور جذبہ عبودیت: لازمہ احسان:

زیر نظر تحریر میں شیخ الہندؒ کے احسانی وعرفانی مقام کا ایک اجمالی جائزہ مقصود ہے۔احسان وعرفان سے مراد

وہ مواجید و احوال نہیں جنھیں فی زمانہ عرفان و احسان کا لازمہ باور کیا جاتا ہے، اگرچہ وسائل اور ذرائع کے درجے میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن یہاں احسان سے مراد بندگی کی وہ خاص اور متعین صورت ہے جو انسان کی کل زندگی کا احاطہ کر کے اس میں استحضار خداوندی اور جذبہ عبودیت کو پیدا کر دیتی ہے ـــــ یہی عبودیت یا بندگی تمام تر فضائل واحسان کی بنیادی صفت ہے۔ غور کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب میں سب سے بڑا لقب عبدہٗ ہے۔ اور عارفین نے سب سے بڑا مقام عبدیت ہی کا بتلایا ہے۔ امام رازی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ شب معراج اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کو کون سا لقب و وصف سب سے زیادہ پسند ہے، تو آپؐ نے فرمایا: عبدیت ـــــ اسی لیے سورۃ اسراء میں آپ کا یہی پسند کردہ لقب نازل ہوا[1] بندگی کا جذبہ اگر ذہن، ارادے اور طبیعت میں راسخ ہو جائے تو زندگی کا ہر میلان، ہر فعل اور ہر تأثر بندگی کی کیفیت سے معمور ہو جاتا ہے اور عبودیت اور استحضار الٰہی انسان کا ''حال'' بن جاتی ہے۔ انسان نیت، ارادے، شعور اور عمل ہر سطح پر تفویض اور سپردگی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے ـــــ اسی استحضار الٰہی کے مراقبے اور خوشنودئ رب کی جستجو کو عارفین ''اخلاص'' سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے انسان کے ذاتی اوصاف میں اگر ایک طرف خاک ساری و خود احتسابی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو دوسری جانب اس کے اعمال و احوال میں برکت اور تھوڑے عمل کی بڑی جزا مرتب ہوتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

رب اشعث مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللّٰہ لآبرہٗ.[2]

''بہت سارے پریشان حال پراگندہ حال، گرد و غبار سے اٹے ہوئے بالوں والے ایسے ہیں جنھیں دروازوں پر دھکیلا جائے، مگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر اگر وہ قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو سچا کر دکھائے''۔

شیخ الہندؒ: ذات اور علم کی عینیت:

شیخ الہندؒ کا درس حدیث ہندوستان میں معروف تھا، چالیس سال تک آپ نے دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس سے قال اللّٰہ و قال الرسول کی صدائے دل نواز لگائی۔ آپ کی زبردست شخصیت کے باعث دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طلباً کی تعداد ۲۰۰ تک پہنچ گئی۔ آپ کے زمانے میں ۸۶۰ طلباً نے حدیث نبویؐ سے فراغت حاصل کی۔ شیخ الہندؒ کے تذکرہ نگار آپ کے درس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حلقۂ درس دیکھ کر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن

وحدیث حضرت کو ازبر تھے۔ اور ائمہ اربعہ کے مذاہب زبان پر۔ صحابہؓ وتابعین، فقہا ومجتہدین کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو ادق اور بھدی بناتے تھے۔ نہایت سبک اور سہل الفاظ بامحاورہ اردو میں اس روانی اور تسلسل سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دریا امنڈ رہا ہے۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، اب بھی کئی دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ وہی منحنی جسم اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان، ضعیف الجثہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا اور بارہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا، مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے، جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے"۔[۳]

معروف مستشرقہ باربرا مٹکاف [Barbara Metcalf] آپ کی تدریسی خصوصیات کے متعلق لکھتی ہیں:

> He was a man of extraordinary energy, teaching ten lessons each day, writing, caring for Muhammad Qasim in his final illness. He was devoted to the school and resisted all invitations to leave it. His fame was especially great in hadith; and his biographer notes, in the course of his career he taught over a thousand students from such distant places as Kabul, Qandahar, Balkh, Bukhara, Mecca, Medina and Yeman. Among them were Anwar Shah Kashmiri, Shabir Ahmed Osmani and Hafiz Muhammad Ahmad, the Leaders of the third generation of ulama at the school.[۴]

حافظے اور استحضار کا یہ عالم تھا کہ "شیخ الہندؒ" نے ایک مرتبہ کتابیں دھوپ میں رکھنے کے لیے باہر نکالیں۔ اتفاق سے میبذی کے کچھ ورق پھٹ گئے۔ حضرت نے ایک طالب علم سے کہا اس کو لکھ لو۔ اس نے کہا کیسے لکھوں میرے پاس وہ کتاب ہی نہیں۔ فرمایا، اچھا! سال گزشتہ پڑھی، امسال بھول گئے۔ پھر فرمایا، اچھا لکھو میں بولتا ہوں،

چناں چہ زبانی لکھوادیا''۔[۵]

اس مقام پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حافظے اور استحضار کی لیاقت عارفین کی تصریحات کے مطابق حلال رزق اور نظروں کی حفاظت سے مشروط ہے، جس سے شیخ الہندؒ پوری طرح بہریاب تھے ـــــــ علم اور شیخ الہندؒ میں اسی عینیت کو آپ کے شیخ و مربی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ایک مختصر سے فقرے میں سمیٹ کر بیان کردیا ہے کہ: ''محمود علم کا کٹھلا ہے''۔[۶] علم و فضل کی یہ لیاقت اور درس و تدریس کی اس شان کے باوجود شیخ الہندؒ کی بے نفسی اور فنائیت ایسی تھی کہ خود فرماتے ہیں:

''میں بارہا گنگوہ حاضر ہوا اور جی میں بھی آیا کہ حضرت مولانا [گنگوہیؒ] سے عرض کردوں کہ مجھے بھی حدیث کی سند دے دیجیے، لیکن کبھی اس درخواست کی ہمت نہ پڑی۔ جب اس نیت سے گیا تو یہی خیال ہوا کہ تو یہ تمنا لے کر تو جاتا ہے، لیکن تجھے کچھ آتا جاتا بھی ہے؟ بارہا خیال ہوا کہ عرض کروں کہ سب کو حضرت سند دیتے ہیں، مجھے بھی سند دیجیے، مگر پھر خیال ہوا کہ مولانا پوچھ بیٹھیں کہ تجھے کچھ آتا بھی ہے، جو سند لیتا ہے؟ تو کیا جواب دوں گا؟ اس لیے کبھی درخواست کی ہمت نہ ہوئی''۔[۷]

چلیے تھوڑی دیر کے لیے استاذ اور شیخ کے سامنے، اور وہ بھی مولانا گنگوہیؒ جیسے استاذ و شیخ کے روبہ رو اس خاک ساری کی توجیہہ کی جاسکتی ہے ـــــ لیکن مولانا محمد شاہ رام پوریؒ تو معاصر تھے۔ ان کے سامنے خاکساری کا اظہار! واقعہ ملاحظہ فرمایئے یہ وہ ہی شخص کرسکتا ہے جس کا نفس مزکی ہوچکا ہو۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

''ثقات سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مرادآباد میں وعظ کی درخواست کی گئی، بہت کچھ عذر کے بعد منظور فرمایا اور بیان شروع ہوا۔ حدیث یہ تھی ''**فقیہ واحد اشد علی الشیطن من الف عابد**'' کے ترجمے کا حاصل ''بھاری'' لفظ سے فرمایا، [کہ ایک فقیہہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے]، مجلس میں ایک پرانے عالم تھے جو محدث کے لقب سے معروف تھے۔ انھوں نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ ''اشد'' کا ترجمہ غلط کیا گیا، ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ تو مولاناؒ بے ساختہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت! مجھ کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مجھ جیسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں اور میں نے ان صاحبوں سے اسی واسطے عذر بھی کیا تھا، مگر انھوں نے مانا نہیں، اب بہت اچھا ہوا حضرت کے ارشاد سے بھی میرے عذر کی تائید ہوگئی اور بیان سے بچ گیا۔ حاضرین کو تو جس قدر ناگواری ہوئی اس کا کچھ پوچھنا نہیں، دانت پیستے تھے کہ یہ کیا لغو حرکت تھی، گو مولاناؒ نے بجائے ناگوار سمجھنے کے یہ کمال کیا کہ نہایت

سکون کے ساتھ ان کے پاس جا کر ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر نہایت نیاز مندی کے لہجے میں ارشاد فرمایا کہ حضرت غلطی کی وجہ معلوم ہو جائے تو آئندہ احتیاط رکھوں۔ انھوں نے کڑک کر فرمایا کہ "أشد" کا ترجمہ آپ نے أثقل سے کیا یہ کہیں منقول نہیں، أضر سے کرنا چاہیے۔ مولاناؒ نے فرمایا اگر کہیں منقول ہو تو؟ انھوں نے کہا کہاں ہے؟ مولاناؒ نے فرمایا حدیث وحی میں ہے کسی نے پوچھا: کیف یاتیک الوحی [آپؐ پر نزول وحی کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟] جواب میں ارشاد ہوا: یاتینی احیانا مثل سلسلة الجرس وهو اشده علی [کبھی وحی مجھ پر گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے] اور ظاھر ہے کہ یہاں أضر [زیادہ نقصان دہ] کے معنی ممکن نہیں أثقل [زیادہ بھاری] ہی کے معنی صحیح ہو سکتے ہیں۔ بس یہ سن کر ان کا تو رنگ فق ہو گیا۔ مگر مولاناؒ نے نہ کچھ اس پر فخر کیا نہ دوبارہ بیان شروع فرمایا"۔[8]

شیخ الہندؒ: فیض قاسمی کا شجرۂ طوبیٰ: خاکساری کا نتیجہ:

للّٰہیت اور خاکساری کے، یہی وہ اوصاف تھے جس نے شیخ الہندؒ کو ترکِ ذات کے مقامِ علیا تک پہنچا دیا تھا۔ اس لیے خدا کا وعدہ ہے کہ جو تواضع اختیار کرے گا ہم اسے رفعت عطا کریں گے ـــــ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ شیخ الہندؒ کے اسی وصف پر روشنی ڈالتے ہوئے، مولانا قاری محمد طیب کے نام گرامی نامے میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے، تو تنکے سے کام لیتا ہے اور پہاڑ رہ جاتا ہے۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ اور مولانا عبد العدل صاحبؒ، حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ العزیز کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ذکی حفظ اور ذہن وغیرہ میں اعلیٰ درجہ رکھنے والے تھے۔ مولانا احمد حسن امروہویؒ دوسرے درجے میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عنایت بھی ان پر سب سے زیادہ تھی۔ ہمارے آقا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان سب میں گرے ہوئے شمار کیے جاتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے جو کام لیا وہ ان میں سے کسی سے نہیں ہوا اور نہ ہو سکا۔ آج فیض قاسمی عالم میں میزاب محمودی سے جاری ہے"۔[9]

شیخ الہندؒ کے مزاج و طبیعت میں اخفا کا بھی غلبہ تھا، اپنے علم و فضل کے اخفا کے حوالے سے آپ ہو بہو اپنے استاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہم رنگ و آہنگ تھے۔ مولانا نانوتویؒ کا یہ مقولہ بہت ہی معروف ہے کہ "اس علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا"۔[10] ـــــ یہی فقرہ شیخ الہند سے اپنے متعلق منقول ہے:

"اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم سے نہ نوازا ہوتا تو اپنے کو اس قدر مٹاتے کہ محمود نام کا کوئی رہ نہ جاتا"۔[11]

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تواضع کی برکت سے آپ کے نام کو رہتی دنیا تک کے لیے علم و فضل سے لے کر حریت اور جہاد تک ہر جگہ نمایاں فرما دیا۔

ذوق عبادت اور حسن معاشرت: اساس بندگی:

عبودیت اور بندگی کو دو بنیادی اوصاف: ذوق عبادت اور حسن معاشرت کے بلیغ عنوانات میں سمویا جاسکتا ہے۔ عبادت، بندگی کا لازمہ اور تخلیق کی وجہ اصل ہے۔ لیکن ضابطے کی عبادت اور ذوقی عبادت میں بہت فرق ہے۔ عبادت کا ذوق اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کے لیے عبادت دل کا سکون اور لذت و فرحت کا سامان بن جائے۔ عبادت کے دو بنیادی مظاہر ہیں: تلاوت اور نماز ـــــ ایسا شخص جسے ذوق عبادت حاصل ہو تلاوت اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور نماز مخاطبت کا۔ اذکار و اوراد کی کثرت اور اس پر استمرار سے مقام عبودیت کو رسوخ کامل حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔

شیخ الہندؒ با جماعت نماز اور نوافل کا غیر معمولی اہتمام:

واقفین حال شہادت دیتے ہیں کہ شیخ الہندؒ کے لیے ذکر، تلاوت اور نماز طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں ـــــ عبادت کی خشت اول نماز با جماعت کی پابندی ہے جس کی عادت رفتہ رفتہ عبادت بن جاتی ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ لکھتے ہیں:

"صلوٰۃ با جماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی"۔[12]

ذوق عبادت کا یہ وافر حصہ شیخ الہندؒ کو زمانہ طالب العلمی ہی میں عطا ہوا تھا۔ با جماعت نماز کے علاوہ صلوٰۃ اللیل اور دیگر اوراد و وظائف سے متعلق مولانا میاں سید اصغر حسینؒ لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا [محمود حسن] ایام طالب علمی ہی سے قیام لیل کے پابند تھے ...... دن کو تعلیم و تعلم کا شغل رہتا تھا، رات کو ادائے اوراد و اذکار معمولہ مشائخ اور تعلیم فرمودۂ حضرت استاذ کا شب کو دس گیارہ بجے تک حضرت استاذ [مولانا محمد قاسم نانوتویؒ] کی خدمت میں رہتے اور اس کے بعد گاہ گاہ رات کو مطالعہ و سبق دیکھتے۔ ذرا آرام کر کے نوافل اور ذکر اللہ میں مصروف ہو جاتے"۔[13]

عبادات و معمولات میں تستر و اخفا کا عالم یہ تھا کہ پوری کوشش فرماتے کہ کسی کو آپ کے معمولات کی خبر نہ ہو۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ لکھتے ہیں:

"صلوٰۃ اللیل سے تو گویا آپ کو عشق تھا۔ جب دیکھا کہ سب سو چکے ہیں، چپکے سے اٹھے اور نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ طویل طویل رکوع اور قیام میں پوری پوری رات گزار دیتے، لیکن جہاں کہیں بھی ذرا سی آہٹ محسوس کرتے کہ کوئی جاگ رہا ہے، فوراً ہی لیٹ جاتے تا کہ دیکھنے والے کو یہ احساس ہو جائے کہ حضرت سو رہے ہیں"۔[۱۴]

کسی بے تکلف نے ایک مرتبہ شیخ الہندؒ سے یہ دریافت کر لیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ لوگوں کے جاگ جانے کے خیال سے نماز کیوں توڑ دیتے ہیں؟ فرمایا:

"بھائی! نفلی نماز کو توڑنے کے بعد دوسرے وقت ان کی قضا میرے لیے زیادہ سہل ہے اور بہتر ہے اس سے کہ لوگ میرے بارے میں حسن ظن رکھیں اور واقع میں میں ایسا نہ ہوں"۔[۱۵]

شیخ الہندؒ: کثرت عبادت کے باعث پاؤں کے ورم پر خوشی:

ایک مرتبہ کثرت عبادت کی بنا پر پاؤں ورم کر گئے تو اس پر خوش ہو کر فرمایا، آج ایک سنت [حتی تورمت قدماہ "حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم ہائے مبارک کثرت قیام کی بنا پر ورم کر جاتے تھے"۔] پر آج اتباع نصیب ہوا"۔[۱۶]

اتباع سنت: مجاہدات سلوک کا نقطۂ منتہا ومقصود:

اتباع سنت تمام تر مجاہدات اور سلوک وعرفان کا پھل ہے۔ شیخ الہندؒ کی اتباع سنت کا یہ عالم تھا کہ:

"قیام دیوبند کے دوران جمعے کے روز دیوبند سے باہر نہر پر تشریف لے جاتے، کپڑے دھوتے، پھر غسل فرماتے، یہاں تک کہ کپڑے پھریرے اور پہننے کے قابل ہو جاتے تو پہن کر ایسے وقت چلتے کہ جمعے کی اذان ہونے لگتی اور اذان سنتے ہی ایک دوڑ لگاتے کہ آیت کریمہ: اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ [جب نماز جمعہ کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو] پر عمل ہو سکے"۔[۱۷]

شیخ الہندؒ: عبادت اور اطاعت کا مظہر کامل:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رأس الأمر فالاسلام وأما عمودہ فالصلوٰۃ وأما ذروۃ سنامہ فالجهاد.[۱۸]

''اس چیز[دین] کا سر اسلام ہے، اس کے ستون نماز اور اس کوہان کی بلندی جہاد ہے''۔

بندگی کی غایت اصلی کے دو بڑے مظاہر ہیں: نماز اور جہاد ــــــ بندگی کے تشکیلی عناصر کا دائرہ ان ہی دو قوسوں سے مکمل ہوتا ہے ــــــ یہ دونوں مظاہر ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہی نہیں عین یک دیگر ہیں اور غایت ان کی ایک ہے: بندگی ــــــ نماز عبادت الٰہی کا مظہر کامل ہے اور جہاد نیابت الٰہی کا۔ شیخ الہندؒ کی زندگی میں بندگی کے یہ دونوں مظاہر پوری شان سے جلوہ گر تھے۔ جہاد سے وابستگی ہی نے انھیں ''اسیر مالٹا'' بنایا تھا اور نماز جسے متذکرہ حدیث میں عبادت کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس میں انہماک کا عالم یہ تھا کہ فرائض تو فرائض ہی تھے شیخ الہندؒ کے معمولہ نوافل، اوراد واذکار اور معمولات کی اس پابندی میں نہ درس وتدریس کی مشغولیت رکاوٹ بنتی تھی نہ ہی تحریک وجہاد کی مصروفیت ــــــ حتیٰ کہ ایام اسیری میں بھی شیخ الہند معمولات اپنی ترتیب کے مطابق انجام دیتے رہے۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

''مولانا عشا کی نماز کے بعد بہت تھوڑی دیر جاگتے تھے کچھ اپنے اوراد پڑھتے تھے اور پھر پیشاب وغیرہ سے فارغ ہوکر وضو فرماتے۔ کبھی کبھی باتیں بھی کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے کیوں کہ دس بجے کے بعد حکماً روشنیاں بجھادی جاتی تھیں۔ جہاں دس بجے اسی وقت سپاہی آواز دیتا تھا۔ سب چراغ اور موم بتیاں بجھانی پڑتی تھیں اور پھر تمام شب جلانے کی اجازت نہ تھی۔ جہاں جہاں کمروں میں برقی روشنیاں تھیں وہاں خود ہی بجھ جاتی تھی۔ البتہ پھر وہ برقی روشنیاں جو کیمپ اور راستوں کی روشنی کے لیے تھیں وہ تمام رات جلا کرتی تھیں ان کا تار برقی کمروں کی روشنی کے تار سے علاحدہ تھا۔ الغرض دس بجے سے سب لوگ سو جاتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے شب کو اٹھتے اور نہایت دبے دبے پیروں سے نکلتے دروازے سے باہر تشریف لاتے۔ پیشاب سے فارغ ہوکر وضو فرماتے، گرمیوں میں تو گرم پانی کی ضرورت ہوتی ہی نہ تھی۔ نل کا پانی مناسب ہوتا تھا۔ سردی کے زمانے میں ہم نے یہ خاص اہتمام کیا تھا کہ چولہے پر کھانے کے بعد ایک بہت بڑے ٹین کے لوٹے میں جو کہ چائے کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے ملتا اور اس میں ٹینٹو پیچ دار لگی ہوئی تھی۔ اور اس میں ہمارے معمولی دس بارہ لوٹے پانی آجاتا تھا۔ پانی خوب گرم کرلیا جاتا تھا اور پھر اسی پاس والے کمرے میں جہاں پر نل لگا ہوا تھا۔ اس لکڑی کے تخت پر جس پر سب کپڑے دھوتے تھے ایک کمبل میں لپیٹ کر عشا کے بعد رکھ دیتے تھے۔ یہ پانی صبح تک خوب گرم رہتا تھا۔ حال آں کہ سردی بہت ہی زیادہ پڑتی تھی۔ اندھیرے ہی میں جا کر اس میں نماز تہجد ادا فرماتے تھے۔ جب اس سے فارغ ہوجاتے تو پھر

چارپائی پرآ کر بیٹھ جاتے تھے اور صبح تک مراقبہ اور ذکرِ خفی میں مشغول رہتے تھے اور ہزار دانوں کی تسبیح ہمیشہ سرہانے رکھی رہتی تھی۔اسمِ ذات کی کوئی مقدار معین کر رکھی تھی اس کو ہمیشہ بالتزام پورا فرماتے۔ مراقبے کا اس قدر انہماک ہوگیا تھا کہ بعض اوقات میں دو دو تین تین مرتبہ باتیں دھراتے مگر سمجھتے نہ تھے۔صبح کی نماز سے پیش تر اکثر پیشاب کرتے اور وضو کی تجدید فرما کر نماز باجماعت ادا فرما کر وہیں مصلےٰ [سجادہ] پرآفتاب کے بلند ہونے تک مراقب رہتے تھے۔اس کے بعد اشراق کی نماز ادا فرما کر اپنے کمرے میں تشریف لاتے۔اس وقت مولانا کے لیے ابلے ہوئے انڈے اور چائے تیار رہتی تھی۔ وہ پیش کردی جاتی تھی۔اس کو نوش فرما کر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے تھے۔اس سے فارغ ہو کر کچھ ترجمۂ قرآن شریف تحریر فرماتے یا اس پر نظر ثانی کرتے یا اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط تحریر فرماتے یا وحید کو سبق پڑھاتے،اتنے میں کھانے کا وقت آجاتا کھانا تناول فرما کر چائے نوش فرماتے تھے۔اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لیے وروالہ یا سینٹ کلیمٹ کیمپ یا بلغار کیمپ میں جانا ہوتا تو وہاں کا قصد فرماتے اور کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے تھے اور اگر جانے کا قصد نہ ہوتا تو آرام فرماتے اور اگر کوئی ملنے کے لیے دوسرے کیمپ میں سے آتا تو اس سے باتیں کرتے۔اگر تیز گرمی کا زمانہ ہوتا تھا تب تو وہیں چارپائی پر اور اگر کچھ بھی سردی ہوتی تو صحن میں دھوپ میں قیلولہ فرماتے تھے۔وہاں پر ہم سب دو تین گدّے ڈال دیتے اور اس پر کمبل اور تکیہ بچھا دیا جاتا تھا اور اگر کسی نے غفلت کی تو خود تکیہ لے جاتے اور ان گدّوں اور کمبل کو بچھا کر آرام فرماتے۔دو تین گدّے ہم نے زائد اسی واسطے لے رکھے تھے جو کہ ہمیشہ علاحدہ رکھے رہتے تھے اور جب تک وہ حاصل نہ ہوئے تھے تو بعض چارپائیوں کے گدّے اٹھا لیے جاتے تھے۔تقریباً دو یا ڈیڑھ گھنٹے تک اسی طرح آرام فرماتے تھے۔پھر قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور پھر وضو فرمانے کے بعد تلاوتِ قرآن شریف، دلائل الخیرات، حزب الاعظم وغیرہ میں مشغول ہوتے مگر قرآن شریف بہت زیادہ پڑھتے تھے۔غالباً روزانہ دس بارہ پارے پڑھتے تھے۔ظہر کی اذان تک اسی حالت میں رہتے تھے پھر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز سے فارغ ہو کر اگر وحید کا سبق ہوتا تو کبھی اس وقت میں اور کبھی صبح کو اپنے اوراد سے فارغ ہو کر کھانے کے وقت تک پڑھاتے تھے۔بلکہ اکثر صبح ہی کو پڑھاتے تھے۔عصر کی نماز کے بعد اکثر مولانا رحمۃ اللہ علیہ ذکرِ خفی لسانی میں مشغول ہوتے تھے وہ ایک ہزار دانے والی تسبیح چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر بیٹھ جاتے اور ذکر کرتے تھے۔مغرب کے بعد بھی ذکرِ خفی میں مشغول

ہو جاتے تھے''۔[19]

شیخ الہندؒ: مجاہدانہ سرگرمیوں کی عدم قبولیت کے خوف سے گریہ:

دین کی سربلندی اور خلافت اسلامی کی بقا و استحکام کے لیے زندان و اسیری، عبادات و اذکار کی پابندی، اور ترجمہ قرآن کی سعادت کے باوصف شیخ الہندؒ کی کیفیت یہ تھی کہ:

''جس وقت مالٹا میں تھے، ایک روز بیٹھے ہوئے رو رہے تھے، ساتھیوں نے پوچھا کیا حضرت گھبرا گئے ہیں؟ یہ لوگ سمجھے کے گھر بار یاد آ رہا ہوگا، یا جان جانے کا خوف ہوگا۔ فرمایا کہ میں اس وجہ سے نہیں رو رہا ہوں جو تم سمجھے ہو، بلکہ اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہ مقبول بھی ہے یا نہیں''۔[20]

حسن خلق بھی عبادت ہے:

ذوق عبادت اور بندگی کا ایک اہم، عظیم اور غالب حصہ مخلوقات سے معاملات اور تعلقات سے متعلق ہے ـــــ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الخلق عیال اللّٰہ، فأحب الناس الی اللّٰہ من أحسن الیٰ عیاله.[21]

''مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبت اس شخص سے ہے، جو اس کے کنبے سے حسن سلوک سے پیش آئے''۔

عام طور پر یہ بات قابل مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ یا عالم درس و تدریس، تصنیف و افتا یا صوفیانہ امور میں مشغول رہتا ہے تو اسے بالعموم کاروبار دنیا اور لوگوں سے میل جول اور تعلق و اختلاط سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے، بلکہ پیش قدمی کر کے اگر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ فی زمانہ مؤخر الذکر غفلت اور اول الذکر انہماک ہی کو سلوک و عرفان کی معراج سمجھا جانے لگا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا ـــــ یہ رویہ فی الحقیقت سیرت نبویؐ، اسوۂ صحابہؓ و اہل بیتؓ اور اخلاق صوفیہ تینوں کے منافی ہی نہیں بلکہ ایک ایسی غیر متوازن شخصیت کا غماز بھی ہے، جو دین کے ایک بہت اہم اور بڑے حصے سے خود کو اپنی ان انفرادی ''ذمے داریوں'' کے باعث مستثنیٰ سمجھنے لگتا ہے۔ جس کے حصول اور جس کی ادائیگی کے لیے نصوص میں متواتر ترغیب و تحریص دلائی گئی ہے:

طریقت بہ جز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

شیخ الہندؒ: ذوق عبادت اور حسن خلق کے جامع:

شیخ الہندؒ اسلاف کے طریق کی اتباع و پیروی میں عبادات و اخلاق دونوں کے توازن کا مظہر تھے

مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری آپ کے عبادات و معاملات کے مابین توازن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طالب علمی کی زندگی کے بعد متصلاً ہی معلمانہ زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے یہ زندگی بھی آپ کی مکمل ترین زندگی ہے۔ دن میں دس دس، گیارہ گیارہ گھنٹے درس کے بعد سلوک و تصوف کے تمام اشغال نہایت پابندی سے ادا کرتے تھے۔ صلوٰۃ باجماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی۔ غرض کہ پورا دن اسی مشغولیت میں صرف ہوتا۔ مہمانوں کی کثرت، ان کی دیکھ بھال اور خدمت، بال بچوں کی تربیت اور اہلِ بیت کے حقوق کی ادائیگی، غرض کہ کوئی سی مشغولیت بھی آپ کو صلوٰۃ باجماعت، ادائے اوراد و وظائف اور قیام اللیل سے مانع نہ ہوتی تھی''۔[۲۲]

شیخ الہندؒ: طالبان علوم سے تعلق اور شفقت:

شیخ الہندؒ، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔ ظاہر ہے طالبان علوم سے ان کا سابقہ واسطہ ہمہ وقتی تھا۔ شیخ الہندؒ کے احوال کا مطالعہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ آپ طالبان علوم کے لیے بے حد شفیق اور مہربان تھے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں: ''[شیخ الہندؒ کو] طالب علموں سے بے حد انس تھا''۔[۲۳] آپ کا علمی رعب اور آپ کی عرفانی وجاہت آپ کے اور طلبا کے درمیان کبھی حائل نہ ہوتی۔ طلبا بے تکلف آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیبؒ سے منقول ہے کہ ایک دن طلبا نے کہا:

''حضرت تیرنا سکھلا دیجیے۔ چناں چہ جمعے کے دن سویرے طلبا کو ہمراہ لے کر دیوبند سے باہر تالاب پر گئے اور ہر ایک کو تیرنا سکھایا۔ ایک پنجابی طالبِ علم نے کہا حضرت! لائیے میں آپ کی کمر مل دوں۔ یہ کہہ کر اس نے کمر ملنا شروع کر دی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا جسم بہت نرم تھا۔ طالبِ علم نے سمجھا میل بہت ہے اس لیے فوراً ہی ریت اٹھا کر ملنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے کھال چھل گئی، مگر حضرت نے اُف نہ کی۔ جب واپس ہوئے تو راستے میں ایک بیل کو دیکھا۔ جس کی کمر سے خون جاری تھا۔ پنجابی طالبِ علم نے کہا کسی ظالم نے اس کو کتنی بری طرح مارا ہے۔ حضرت نے فرمایا جی ہاں کسی پنجابی نے اس کی کمر ملی ہوگی''۔[۲۴]

اللہ اکبر! ایک تو طلبا پر شفقت کا یہ عالم، اس طالب علم کی غلطی اور اپنی تکلیف پر ادنیٰ گرانی کا اظہار کیے بغیر بات کو مزاح میں ٹال دینا یہی شیخ الہندؒ کا وصف تھا۔.....(جاری ہے)

حواشی

(۱) ادریس کاندھلویؒ، سیرۃ المصطفیٰ، کراچی: مکتبہ عمر فاروق، ۲۰۱۰ء، جلد ۱، صفحہ ۲۶۳۔

(۲) مسلم بن الحجاج القشیریؒ، الصحیح المسلم، کتاب البر والصلة، رقم ۱۲۸۱۔

(۳) عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، لاہور: مکتبہ رشیدیہ، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۲۳۶۔

(4-) Barbara Metcalf, "The Madrasa at Deoband: A Model for Religious Education in Modern India", *Modern Asian Studies,* 12, I, [1978], p. 122.

(۵) محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہہ الامت، لاہور: مکتبہ مدنیہ، ۱۹۹۲ء، جلد ۲، قسط ۷، صفحہ ۹۳۔

(۶) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ [مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری]، کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام، ۲۰۰۷ء، صفحہ ۱۴۳۔......(۷) محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، لاہور: مکتبہ الحرمین، [س-ن]، جلد ۲، صفحہ ۶۰۷۔......(۸) اشرف علی تھانویؒ، ''ذکر محمودؒ''، مشمولہ تذکرہ شیخ الہندؒ، صفحات ۵۳۰-۵۳۱۔

(۹) حسین احمد مدنیؒ، مکتوبات شیخ الاسلام، کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام، ۱۹۹۴ء، جلد ۲، صفحات ۲۰۰-۲۰۱، مکتوب ۶۲۔

(۱۰) محمد یعقوب نانوتویؒ، ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی''، مشمولہ نادر مجموعہ رسائل جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، کراچی: میر محمد کتب خانہ، [س-ن]، صفحہ ۸۔......(۱۱) میاں اصغر حسینؒ، حیات شیخ الہندؒ، لاہور: ادارۂ اسلامیات، ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۶۷۔......(۱۲) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۰۔

۱۳- میاں اصغر حسینؒ، حیات شیخ الہندؒ۔......(۱۴) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۰۔

۱۵- ایضاً، صفحہ ۱۵۱۔......(۱۶) محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہہ الامت، لاہور: مکتبہ مدنیہ، ۱۹۸۶ء، جلد ۱، صفحہ ۱۰۶۔

۱۷- ایضاً۔......(۱۸) محمد بن عبداللہ الحاکم النیسابوریؒ، المستدرک علی الصحیحین، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲م، کتاب الجهاد، جلد ۲، صفحہ ۸۶، رقم ۲۴۰۸۔......(۱۹) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحات ۱۵۱-۱۵۳۔......(۲۰) اشرف علی تھانویؒ، ملفوظات حکیم الامتؒ، ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۰ھ، جلد ۳، صفحہ ۱۲۷، ملفوظ ۱۹۳۔......(۲۱)- سلیمان بن احمد الطبرانیؒ، المعجم الأوسط، قاہرہ: دارالحرمین، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵م، باب الميم، من اسمه محمد، محمد بن عثمان بن أبي شيبة، جلد ۵، صفحہ ۳۵۶، رقم ۵۵۴۱۔......(۲۲) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۰۔۲۳- حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، لاہور: مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۵۹۔......(۲۴) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۶۸۔